شرائع سابقہ، عرب جاہلیہ اور اسلام

* ڈاکٹر صاحبزادہ ساجد الرحمٰن

شرائع سابقہ، عرب جاہلیہ اور اسلام کے حوالے سے قدیم علماء کے ہاں تین سوالات پر تفصیلی بحث پائی جاتی ہے، ذیل میں اختصار کے ساتھ اسے پیش کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

① کیا قبل از بعثت نبی اکرم ﷺ کی عبادت کسی شریعت کے مطابق تھی؟

② کیا بعثت نبوی ﷺ کے بعد شریعت سابقہ پر عمل جاری رہا؟

③ عرب جاہلیہ کے رسوم ورواج سے متعلق اسلام نے کیا طرزِ عمل اختیار کیا ہے؟

علماء نے اس سلسلے میں اختلاف کرتے ہوئے تین مختلف مسالک اختیار کیے ہیں۔ چنانچہ پہلے سوال پر جمہور متکلمین اور بعض مالکی فقہاء کا موقف یہ ہے کہ قبل از بعثت نبی اکرم ﷺ کی عبادت کسی شریعتِ سابقہ کے مطابق نہیں تھی جب کہ احناف وحنابلہ، ابن الحاجب اور قاضی بیضاوی اس کے اثبات کے قائل ہیں اور بعض محققین مثلاً امام غزالی، امام آمدی اور قاضی عبدالجبار وغیرہ توقف کے قائل ہیں، کیوں کہ اس کے وقوع کی کوئی قطعی دلیل موجود نہیں (1)۔ جو حضرات اثبات کے قائل ہیں ان کے ہاں تعیین شریعت میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ کسی نے اوّلیت کی مناسبت سے اسے حضرت آدم علیہ السلام کی شریعت قرار دیا ہے۔ کسی نے آیت ﴿شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَاوَصّٰى بِهٖ نُوْحًا﴾(2) کی رعایت سے اسی طرح حضرت نوح علیہ السلام کی شریعت قرار دیا ہے۔ کسی نے بفحوائے ﴿اَنِ اتَّبِعْ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ﴾(3)، حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شریعت سمجھی ہے۔ (اور یہی قول راجح ہے) بعض نے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور بعض نے برعایت قرب زمانی، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شریعت ہونے کی طرف میلان ظاہر کیا ہے۔ احناف نے مجموعی طور پر جملہ شرائع کو قرین قیاس سمجھا ہے (4)۔

---

* ایسوسی ایٹ پروفیسر، مدیر "فکر ونظر" ادارہ تحقیقات اسلامی، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد۔

اثبات اور نفی دونوں آراء رکھنے والوں کے اپنے اپنے دلائل ہیں اور وہ ایک دوسرے کے دلائل کا رد بھی پیش کرتے ہیں۔

اب دوسرے سوال یعنی بعد از بعثت، شریعت میں شرائع سابقہ کی حیثیت کی طرف آیئے۔ اساسی عقائد کے سلسلے میں کوئی اختلاف نہیں، کیوں کہ ہماری شریعت، سابقہ شریعتوں کا کلی طور پر نسخ نہیں کرتی۔ چنانچہ ایمان کا وجوب نیز کفر، زنا، چوری اور قتل کی حرمت بدستور موجود ہیں۔ دیگر احکام کی صورت میں یہ کہ جن کا ذکر ہماری شریعت (کتاب وسنت) میں نہیں آیا، یا جن کو ہماری شریعت نے منسوخ کر دیا، وہ متفقہ طور پر ہمارے لیے شریعت کی حیثیت نہیں رکھتے اور جن احکام کا ہماری شریعت میں اثبات کیا گیا مثلاً ﴿كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ﴾ وہ بالاتفاق ہمارے لیے واجب العمل ہیں (5)۔

اختلاف اس امر میں ہے کہ سابقہ شریعتوں کے جن احکام کا ثبوت قرآن یا حدیث میں اس طرح ملتا ہے کہ نہ انہیں منسوخ کیا گیا ہے اور نہ عائد، ان کی حیثیت کیا ہے؟ پہلے سوال کی طرح یہاں بھی تینوں اختلافی مؤقف ملتے ہیں۔ جمہور احناف و مالکیہ نیز بعض شوافع اور ایک روایت کے مطابق امام احمد رحمہ اللہ کا مسلک یہ ہے کہ سابقہ تحریف شدہ الہامی کتابوں کی رُو سے نہیں بلکہ اس اعتبار سے کہ ہمارے نبی ﷺ کو بذریعہ وحی سابقہ شرائع کے ان احکام کا علم ہوا ہے، یہ ہمارے لیے شرعی حیثیت رکھتے ہیں، جب تک کہ ہماری شریعت میں ان کے خلاف کوئی حکم وارد نہ ہوا ہو (6)۔ اشاعرہ، معتزلہ، شیعہ اور اکثر شافعی فقہاء کے ہاں نیز ایک روایت کی رُو سے امام احمد رحمہ اللہ کے نزدیک ہم سے پہلے کی شرائع ہمارے لیے شرعی حیثیت نہیں رکھتیں، اسی مؤقف کو امام غزالی، امام آمدی، امام رازی، اور امام ابن حزم الظاہری رحمہم اللہ اور دیگر بہت سے علماء نے اختیار کیا ہے (7)۔

ابن القشیری اور ابن برہان نے تیسرا مؤقف اختیار کیا ہے، یعنی جب تک کوئی دلیل صحیح نہ ملے توقف سے کام لیا جائے، دلائل اور جوابی دلائل کا سلسلہ یہاں بھی موجود ہے، مثال کے طور پر قائلین اثبات ﴿أُولَئِكَ الَّذِينَ هَدَى اللَّهُ فَبِهُدَاهُمُ اقْتَدِهْ﴾ اور ﴿إِنَّا أَنْزَلْنَا التَّوْرَاةَ فِيهَا هُدًى وَنُورٌ يَحْكُمُ بِهَا النَّبِيُّونَ﴾ (9) جیسی آیات سے استدلال کرتے ہیں۔

جواب دینے والے یہ کہتے ہیں کہ پہلی آیت میں ﴿هُدًى﴾ سے مقصود وہ نورِ ہدایت ہے۔ جو سب

انبیاء علیہم السلام میں مشترک ہے۔ یعنی اساسی عقائد اور کلیاتِ خمسہ (نفوس، عقول، انساب، دین اور اموال کا تحفظ) اور دوسری میں ﴿ يَحْكُمُ بِهَا النَّبِيُّوْن ﴾ خبر کا صیغہ ہے، امر کا نہیں۔ اسی طرح قائلین اس حدیث سے استدلال کرتے ہیں کہ حضور علیہ السلام نے جب حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو قاضی بنا کر یمن بھیجا اور پوچھا کہ وہ کس بنیاد پر فیصلہ کریں گے تو انہوں نے کتاب و سنت کے بعد اجتہاد کا ذکر کیا۔ حضور ﷺ نے اسے درست قرار دیا اور شرائع ماقبل کے اتباع کی ہدایت نہیں فرمائی۔ اس طرح حدیث ((كان النبّى يبعث الى قومه خاصة و بعثت الى الناس عامة)) سے یہ استدلال کیا جاتا ہے کہ سابقہ شریعتیں انبیائے سابقین علیہم السلام کی اپنی قوم کے لیے مخصوص تھیں اور شریعہ اسلامیہ سب پر محیط اور سب کی ناسخ ہے۔ جواب میں یہ کہا جاتا ہے کہ حدیث معاذ میں شرائع ماقبل کا الگ ذکر کرنے کی ضرورت اس لیے نہ تھی کہ وہ قرآن میں شامل ہیں یا اس لیے کہ ان کی ضرورت نسبتاً کم مسائل میں پڑ سکتی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ہماری شریعت گزشتہ شریعتوں کو مطلقاً منسوخ نہیں کرتی، چنانچہ قصاص کا حکم، زنا اور چوری کی حدود ہمارے ہاں باقی رہیں، وغیرہ وغیرہ۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ نے اپنے مخصوص پیرایہ بیان میں اس موضوع کو اس طرح بیان فرمایا:

> "جس طرح ہر ایک دین کے عقائد جن کی تبلیغ کے لئے کوئی نبی مبعوث ہوا ہے ایک ہیں، اسی طرح بنیادی نیکیاں بھی ایک جیسی ہیں، چنانچہ ہر ایک دین میں جو خدائے پاک کی طرف سے نازل ہوا ہے، طہارت، نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج کو فرض قرار دیا گیا ہے (یہ الگ بات ہے کہ ان کا طریق ادا ایک دوسرے سے مختلف ہو) نوافل عبادت کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں قرب حاصل کرنے کی تعلیم ہر ایک دین میں موجود ہے مثلاً مرادوں کو پورا ہونے کے لیے دُعا مانگنا، صبح و شام اللہ تعالیٰ کی یاد میں مشغول رہنا جس کے لیے ذکر کا لفظ شروع میں استعمال ہوتا ہے، نیز کتاب منزّل کی تلاوت کرنا اور اس کو ثواب سمجھنا۔ اس بات پر بھی سب انبیاء علیہم السلام کا اتفاق ہے کہ مثلاً نکاح جائز ہے اور سفاح حرام و ناجائز ہے۔ جو حکومت دنیا میں قائم ہو، عدل و انصاف کی پابندی کرنا اور کمزوروں کو ان کے حقوق دلانا اس کا فرض ہے۔ اس طرح یہ بھی اس کا فرض ہے کہ مظلوم اور جرائم

کا ارتکاب کرنے والے کو کیفر کردار تک پہنچائے۔

عموماً ہر ایک نبی کو یہ حکم ہوتا ہے کہ وہ اعدائے دین کے ساتھ جہاد کرے اور اللہ تعالیٰ کے دین اور اس کے احکام کی اشاعت و تبلیغ میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھے۔ یہ دین کے وہ اصول ہیں جن پر سب ادیان کا اتفاق ہے۔ اس لیے تم دیکھو کہ قرآن میں ان باتوں کو مسلمات کے پیرایہ میں پیش کیا گیا ہے اور ان کی توجیہہ نہیں کی گئی۔ مختلف ادیان میں اگر اختلاف ہے تو وہ فقط ان احکام کی تفاصیل اور جزئیات اور طریق ادا کے متعلق ہے۔ مثلاً موسیٰ علیہ السلام کی شریعت میں یہ حکم تھا کہ نماز پڑھتے وقت بیت المقدس کی طرف منہ پھیر لیا کریں، برخلاف اس کے ہمارے رسول اللہ ﷺ کو حکم دیا گیا کہ وہ خانہ کعبہ کی طرف رُخ کریں۔ اسی طرح موسیٰ علیہ السلام کی شریعت میں زانی کی سزا رجم یعنی کہ اس کو سنگسار کیا جائے، لیکن ہماری شریعت میں شادی شدہ کے لیے رجم اور غیر شادی شدہ کے لیے سو (100) دُرّے مارنا سزا مقرر ہے، علیٰ ہذا القیاس۔ شریعت موسوی میں قتل عمد کی سزا قصاص ہے اور قرآن مجید نے دیت (خون بہا) کو بھی جائز قرار دیا ہے۔ (جب کہ مقتول کے وارث راضی ہوں) عبادات کے اوقات و ارکان میں جو اختلاف ہے وہ اسی قبیل سے ہے۔ انہی اوضاع خاصہ اور ارتفاقات کی صورت ہائے مخصوصہ کو (جو حالاتِ حاضرہ کے لحاظ سے بدلتی رہتی ہیں) شرعۃ اور منہاج کہتے ہیں''(10)۔

عرب جاہلیہ اور اسلام

یہ تو سابقہ شریعتوں سے متعلق اسلام کا رویہ تھا جسے علماء کی آراء کی روشنی میں پیش کیا گیا، اب اس سے تھوڑا آگے بڑھ کر ہمیں اس بحث کو بھی چھیڑنا ہے کہ قرآن کے اوّلین مخاطب عربوں کے متعلق اسلام نے کیا طرزِ عمل اختیار کیا۔ اس رجحان و رویہ کا اندازہ لگانے کے لیے احادیثِ طیبہ بنیادی اہمیت رکھتی ہیں۔

آنحضرت ﷺ کی احادیثِ طیبہ کا بغور جائزہ لیں تو دونوں طرح کا طرزِ عمل سامنے آتا ہے یعنی بعض چیزوں کو بالکل مسترد کر دیا گیا اور اس معاشرے میں جو خیر کے پہلو تھے ان کو قبول کرنے میں کوئی تامل نہیں کیا، بلکہ وہ

اشخاص جو زمانہ جاہلیت میں عزت و احترام رکھتے تھے جب اسلام لائے تو آنحضرت ﷺ نے انہیں اسی قدر و منزلت سے سرفراز فرمایا، ارشادِ رسالت مآب ﷺ ہے:

((خیارهم فی الجاهلیة خیارهم فی الاسلام اذا فقهوا))(11)۔

''لوگوں میں جو جاہلیت میں بہتر تھے، اسلام میں بھی بہتر ہیں، اگر دین کی سمجھ حاصل کر لیں''

علامہ بدرالدین عینی رحمہ اللہ اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں:

((و یرید بقوله خیارهم اذا فقهوا ان من کانت لهٗ ماثرة و شرف فی الجاهلیة فأسلم وفقهه فی الدین احرز ماثرته القدیمه و شرفه الثابت الی ما استفاده من المزید بحق الدین ومن لم یسلم فقد هدم شرفه وضیع قدیمه))(12)۔

''آپ ﷺ کے قول (خیرهم اذا فقهوا) سے مراد یہ ہے کہ جس کسی کو زمانہ جاہلیت میں شرف و امتیاز حاصل تھا اور پھر وہ اسلام لے آیا اور دین کی سمجھ بوجھ پیدا کر لی تو اس نے اپنے امتیاز قدیم اور شرف ثابت کو ملا لیا، اس امتیاز کے ساتھ جو اسے دین کے سبب حاصل ہوا ہے اور جو اسلام نہ لایا، اس نے اپنے شرف کو منہدم کر دیا اور امتیاز قدیم کو ضائع کر دیا''۔

مثال کے طور پر عتاب بن اسید کو پیش کیا جا سکتا ہے جو فتح مکہ کے موقع پر ایمان لائے، وہ اس وقت مکہ کے ''گورنر'' تھے(13) تو آنحضرت ﷺ نے انہیں اپنے منصب پر برقرار رکھا۔

ارشادِ رسالت مآب ﷺ ہے:

((یعمل فی الاسلام بفضائل الجاهلیة))(14)

''دورِ جاہلیت میں جو اخلاقی فضائل موجود تھے، دورِ اسلام میں بھی ان پر عمل جاری رہے گا''

اس کے لیے علاوہ اور مثالوں کے ''حلف الفضول'' کو بطورِ مثال پیش کیا جا سکتا ہے کہ بعثت کے بعد بھی آنحضرت ﷺ فرماتے تھے:

''اس معاہدہ کے مقابلے میں اگر مجھ کو سرخ رنگ کے اونٹ بھی دیئے جاتے تو نہ بدلتا اور آج بھی ایسے معاہدہ کے لیے کوئی بلائے تو میں حاضر ہوں'' (15)۔

لیکن اس کے ساتھ ساتھ دوسری طرف بھی واضح ارشادات موجود ہیں:

((كل دم و مال كان فى الجاهلية تحت قدمى هاتين))(16)

''دورِ جاہلیت میں جو کوئی خون یا مال کسی پر عائد ہوتا تھا وہ میرے ان دونوں قدموں کے نیچے ہے''۔

((كل ربا من الجاهلية موضوع))(17)

''جاہلیت کا ہر سود ختم کیا جاتا ہے''۔

((كل دين فى الجاهلية موضوع))

''زمانہ جاہلیت کا ہر قرض ختم کیا جاتا ہے''۔

عرب جاہلیہ کی روایت سے متعلق شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کی رائے

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

''شارع اسلام نے عرب اوّل کے عرف کو اس لیے ملحوظ رکھا کہ وہ اسلامی احکام کے اوّلین مخاطب تھے، اکثر احکام شریعہ میں انہی کی ذہنیت اور انہی کی عادات کو ملحوظ رکھا گیا'' (19)۔

حجۃ اللہ البالغہ میں ہی چند صفحات آگے چل کر شاہ صاحب نے اس کی تفصیل بیان فرمائی:

''جاہلیت کے زمانہ میں سود خوری عام ہوگئی تھی، اس لیے اس کے جاری رکھنے سے منع کیا گیا۔ آنحضرت ﷺ کے دادا عبد المطلب نے خون بہاء کی مقدار دس اونٹ مقرر کی تھی، لیکن کچھ عرصہ کے بعد جب انہوں نے دیکھا کہ لوگ قتل ناحق سے باز نہیں آتے تو انہوں نے اس کی مقدار ایک سو (100) اونٹ تک بڑھا دی، پیغمبر خدا ﷺ نے اس کو برقرار رکھا

’’قسامۃ‘‘ جس کا حدیثوں میں ذکر آتا ہے اس کو سب سے پہلے ابو طالب نے رواج دیا۔ عرب کا دستور تھا کہ قوم کا رئیس ان کی آمدنی سے چوتھا حصہ وصول کرتا تھا۔ آپ ﷺ نے اسی کو اور بھی گھٹا کر مالِ غنیمت میں سے 1/5 حصہ بحق سرکار لینے کا حکم نافذ کیا، عشر اور خراج آپ کی بعثت سے قبل کیقباد اور اس کے بیٹے نوشیرواں نے اپنی رعیت پر عائد رکھا تھا، شرع نے بھی تقریباً اس کو بحالہ قائم رکھا۔ بنی اسرائیل میں زانی کو رجم کی سزا دینا، چور کا ہاتھ کاٹنا اور جان کے بدلے جان، اور آنکھ کے بدلے آنکھ وغیرہ، سزائیں مقرر تھیں۔ شریعت محمدیہ ﷺ نے ان میں کوئی ترمیم و تنسیخ نہیں کی‘‘ (20)۔

اس ضمن میں مشہور برطانوی محقق N.J.Coulson کی رائے بھی قابل غور ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"Sunnite political theory represents an amalgam of Islamic Principles and Pre-Islamic Practice-rule by the traditional tribal aristocracy subject to the dictates of the religious law. Ithna-ashrite political theory, on the other hand, renounces any connection with Pre-Islamic Practice and sees the sole source of authority to lie in the founder-Prophet and his attributes as a religious leader. The respective attitude adopted by the two groups towards the relationship between the Qur'anic laws and Pre-Existing custom are not only directly parallel with their district political concepts but are a necessary and integral part of them. Juristically as well as Islam meant a re-orientation and modification of existing practice for the Sunnites, while for the Ithna-Asharites it marked a completely new point of departure" (21).

''سیاست کا سنی نظریہ اسلامی تعلیمات اور قبل از اسلام کے معاشرتی رواج کا ایک آمیزہ پیش کرتا ہے۔قبائلی سطح کا روایتی نظام سرداری، جسے شریعت کے احکام کا پابند کر دیا گیا ہو'' دوسری طرف سیاست کا اثنا عشری نظریہ ہے جو قبل از اسلام کے رسم و رواج سے کسی طرح بھی وابستگی کو رد کرتا ہے۔ یہ نظریہ بانیٔ اسلام یعنی پیغمبر کی ذات و صفات کو اقتدار کا سرچشمہ تصور کرتا ہے، احکام قرآنی اور زمانہ ماقبل کے رسم و رواج کے ربط باہمی سے متعلق دونوں نظریات کا رویہ نہ صرف ان کی اپنی اپنی سیاسی روایات کے عین متوازی ہے بلکہ ان کا ایک لازمی اور بنیادی حصہ بھی ہے۔ فقہی اور سیاسی دونوں اعتبار سے اسلام اہل سنت کے لیے رائج الوقت معاشرت کی اصلاح یا تشکیل نو سے عبارت تھا جب کہ اثنا عشریوں کی نگاہ میں اس کی راہ یکسر الگ تھی''۔

اس بحث کے بعد ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مختصراً یہ بھی واضح کیا جائے کہ احکام اسلامی اور رسوم و رواج کو جاننے کے لیے عرب جاہلیہ کے معاشرتی خط و خال سے واقفیت کیوں ضروری ہے؟ اور اس واقفیت کے بغیر اسلام کے مصدر اوّل قرآن مجید کے معانی و مفاہیم کا تعین مشکل ہی نہیں بلکہ بعض مقامات پر ناممکن ہو جاتا ہے۔

قرآن مجید اور عہدِ نبوی ﷺ کے نظام و معاشرہ کو سمجھنے کے لیے عرب جاہلیہ کے نظام سے واقفیت کی ضرورت

ہمارے دین کا مصدر اوّل قرآن مجید ہے، اس کو سمجھنے کے لیے علماء نے کچھ اصول بیان فرمائے ہیں۔ سب سے پہلا اصول یہ ہے کہ خود قرآن مجید ہی سے اس کو سمجھا جائے۔ ﴿القرآن یفسر بعضہ بعضا﴾ ''قرآن کا کچھ حصہ کچھ حصے کی تفسیر کرتا ہے''۔

دوسرا اصول یہ ہے کہ سیاق و سباق کو پیش نظر رکھا جائے۔

تیسرا اصول یہ ہے کہ تعامل امت مدِنظر رہے، یعنی پوری اُمت کا جو تعامل چلا آ رہا ہے وہ بھی قرآن مجید کے فہم میں معاون ہے۔ تعامل اُمت کو نظر انداز کر کے قرآن فہمی ناممکن ہے۔

قرآن فہمی کا چوتھا ذریعہ علم الحدیث ہے۔

پانچواں ذریعہ آثار واقوال صحابہ بیان کیا گیا ہے،

چھٹا ذریعہ قرآن کی زبان سے واقفیت ہے۔

اور آخری ذریعہ جو ہمارا موضوع ہے وہ یہ ہے کہ عربوں کے تمدن اوران کی عادات سے واقفیت بھی ضروری ہے یعنی جس ماحول میں قرآن مجید نازل ہوا تھا، اس سے باخبر ہونا بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ قرآن مجید میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے :

﴿وَ لَيْسَ الْبِرُّبِاَنْ تَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا وَلٰكِنَّ الْبِرَّمَنِ اتَّقٰى وَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا وَ اتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ﴾(21)۔

''یہ کوئی نیکی نہیں ہے کہ تم لوگ مکان کے پچھواڑے سے آؤ، بلکہ نیکی یہ ہے کہ تم دروازہ سے آؤ''۔

اب اس سے کیا سمجھا جائے؟ اس کا کیا مطلب ہے؟ درحقیقت عربوں کی یہ عادت تھی کہ وہ طواف کر کے واپس آتے تھے تو جس دروازے سے جاتے تھے اس سے واپس نہیں آتے تھے۔ مقصد ان کا یہ ہوتا تھا کہ طواف کرنے کے بعد اب پاک ہو گئے ہیں اس لیے ناپاک دروازے سے داخل نہیں ہوں گے بلکہ پچھواڑے سے داخل ہوں گے۔ اب جب تک عرب جاہلیہ میں پائی جانے والی اس رسم کا علم نہ ہو قرآن مجید کی مذکورہ آیہ کریمہ کا ادراک ممکن نہیں۔

امام قرافی رحمہ اللہ نے آیات کے مفہوم کو سمجھنے کے لئے یہ قاعدہ بتایا ہے کہ الفاظ کا مفہوم دو قسم کا ہوتا ہے۔ ایک وہ جن سے حقیقت کی طرف اشارہ ہوتا ہے، دوسرا وہ جس میں حقیقت پر عادت یعنی رواج غالب ہوتا ہے۔ متکلم جب بات کرتا ہے تو اس کے ذہن میں وہ حقیقت رواج کے ساتھ اس طرح خلط ملط ہو جاتی ہے کہ دونوں لازم وملزوم معلوم ہوتے ہیں اور جب بھی وہ اس کے بارے میں بیان کرتا ہے تو حقیقت پر رواج کے غالب ہونے کے سبب وہ رواج ہی کی بات کرتا ہے اور حقیقت پوشیدہ ہو جاتی ہے۔ لیکن جب حکم لگایا جاتا ہے تو رواج در حقیقت کو الگ الگ کر کے حقیقت پر حکم لگایا جاتا ہے۔ امام قرافی رحمہ اللہ اس قاعدہ کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

((المفهوم ان لم يخرج مخرج الغالب كان الحجة عند القائلين بالمفهوم و اذا خرج مخرج الغالب لا يكون حجة اجماعا۔ وضابطه ان يكون الوصف الذی وقع به التقييد غالباً علی تلك الحقيقة وموجودامعها فی اكثر صورها۔ هذا لم يكن موجودا معها فی اكثر صورها فهو المفهوم الذی هو حجة))(23)۔

"کسی لفظ کی حقیقت کا مفہوم اگر غالب عادت ورواج کی جگہ نہ لے لے تو جولوگ مفہوم مخالف کے قائل ہیں، ان کے نزدیک حجت ہے۔ اگر وہ غالب عادت ورواج بن جائے تو اجماعاً حجت نہیں ہے۔

اس کا قاعدہ یہ ہے کہ وہ وصف جس سے اس حقیقت کو مقید کیا ہے اور جو اس حقیقت پر غالب ہے، اس کے ساتھ اکثر صورتوں میں موجود ہو اور اگر اکثر صورتوں میں موجود نہ ہو تو وہی حقیقی مفہوم ہے اور وہ حجت ہے"۔

امام قرافی رحمہ اللہ نے قرآن مجید سے اس کی مثال اس آیۃ کریمہ سے دی ہے:

﴿وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ﴾(24) "اپنے بچوں کو فاقہ کے ڈر سے قتل نہ کرو"

اس کا اگر مفہوم مخالف لیں تو یہ نکلتا ہے کہ اگر فاقہ کا ڈر نہ ہو تو بچوں کو قتل کرنا حرام نہیں ہے، جائز ہے۔ یہ مفہوم اجماعاً لغو ہے۔ کیوں کہ آدمی اپنی اولاد کو کسی شدید ضرورت اور انتہائی مجبوری و دباؤ کے تحت ہی ہلاک کر سکتا ہے، پدرانہ شفقت اس قتل سے مانع ہوتی ہے۔ اب اس آیۃ میں جو خشیۃ املاق کی قید ہے، وہ اس معاشرہ میں اس عمومی رواج کے سبب ہے جو اکثر حالات میں اس قتل کا سبب بنتا تھا، وہ اپنے بچوں کو فاقہ کے خوف سے قتل کرتے تھے یا لڑکیوں کو اپنی رسوائی کے سبب زندہ درگور کرتے تھے(25)۔

امام قرافی رحمہ اللہ نے تو صرف قتل اولاد کے رواج والی آیۃ پر اکتفا کیا ہے، قرآن مجید کی دیگر آیات میں بھی اس غالب رواج کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ اس قاعدہ کو سمجھے بغیر اگر ان کا مفہوم مخالف لیا جائے تو قرآن مجید کے مسلمہ احکامات وآیات کے خلاف ہوتا ہے۔

مندرجہ ذیل آیات ملاحظہ ہوں:

﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوا الرِّبٰٓوا اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً﴾(26)

''اے ایمان والو! سود چند در چند نہ کھاؤ''۔

اگر اس آیۃ کا مفہوم مخالف لے لیں تو یہی نکلے گا کہ صرف سود مرکب حرام ہے اور سود مفرد حلال ہے۔ حالانکہ دوسری آیات سے سود کی مطلق حرمت ثابت ہے۔ یہاں بھی یہی بات ہے کہ سود پر ان کا رواج ''اضعافا مضاعفۃ'' غالب تھا۔ اس لیے ربا کو اس وصف اور قید کے ساتھ بیان کیا ہے۔ دوسری آیۃ میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَلَا تُكْرِهُوْا فَتَیٰتِكُمْ عَلَى الْبِغَآءِ اِنْ اَرَدْنَ تَحَصُّنًا﴾(27)

''اپنی باندیوں کو زنا پر مجبور نہ کرو اگر وہ پاک دامنی کی خواہش مند ہوں''۔

دورِ جاہلیہ میں کنیزوں سے ان کی مرضی کے خلاف بدکاری کے اڈے چلوائے جاتے تھے اور انہوں نے اس حرام کی کمائی کو اپنی روزی کا ذریعہ بنایا ہوا تھا۔ اگر اس آیۃ کے مفہوم کو دیکھیں تو یہی نکلتا ہے کہ اگر وہ اپنی مرضی سے زنا کرائیں تو اس کی اجازت ہے۔ اس آیۃ میں بھی اسی دور کے رواج کی طرف اشارہ ہے۔ کیوں کہ غالب اکثریت ایسی ہی باندیوں کی تھی جو اس مکروہ فعل کو ناپسند کرتی تھیں۔ اسی لیے اس آیۃ میں نفس واقعہ کو بیان کیا گیا ہے۔ حکم حقیقت پر ہی لگایا جائے گا۔ ان تینوں آیات میں قید واقعی ہے، قید احترازی نہیں، یعنی یہ قید واقعات و رواج کے سبب لگائی گئی ہے، کسی چیز سے احتراز کی غرض سے نہیں۔

شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

> ''شرائع کا نزول انہی لوگوں کی ذہنی حالت اور عقائد و افکار کو ملحوظ رکھ کر ہوتا ہے جو ان کے خزانہ دماغ اور اعماق قلب میں مخزون ہیں۔ ان عادات کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاتا جن کے اثرات ان کے رگ و پے میں سرایت کیے ہوئے ہیں۔ بنی اسرائیل پر اونٹ کا گوشت اور اونٹنی کا دودھ حرام کیا گیا لیکن بنی اسماعیل کے لیے یہ چیزیں حلال کر دی گئیں۔ اس میں یہی راز ہے''۔

اسی اصول کی ایک فرع یہ بھی ہے کہ ”یحل لھم الطیبات ویحرم علیھم الخبائث“ ارشاد فرما کر یہ تشریح نہیں فرمائی کہ طیبات کون سی چیزیں ہیں اور خبائث کا کن چیزوں پر اطلاق ہوتا ہے، اس کو خالص عربی النسل عربوں کے مذاق اور ان کی عادات مقبولہ پر چھوڑ دیا گیا۔ اسلام میں بھانجی کے نکاح کو حرام قرار دیا گیا حالانکہ یہود کے لیے جائز تھا۔ کیوں کہ عربوں کے ہاں جو قرآن کے اوّلین مخاطب تھے، بھانجے اور بھانجی کو ایسا سمجھتے تھے گویا وہ انہی کی قوم کے افراد ہیں۔ برخلاف اس کے یہودی ان کو اجنبی قوم کے افراد خیال کرتے تھے۔ قرآن مجید میں عربوں کی ذہنیت کو ملحوظ رکھا گیا۔ اسی طرح یہودیوں کے لیے بچھڑے کے گوشت کو اس کی ماں کے دودھ میں پکا کر کھانا حرام اور ناجائز تھا، عربوں کے کان میں اس حرمت کی بھنک تک نہیں ڈالی گئی، اس کی حلت و حرمت کا راز بھی مخاطبین کی ذہنی حالت کو ملحوظ رکھنے میں مضمر ہے“ (28)۔

یہ بات کسی حد تک واضح ہوگئی ہے کہ قرآن و اسلام کے اوّلین مخاطب عربوں کے طرزِ معاشرت، رسوم و رواج، سیاسی و قانونی معاملات سے بخوبی علم کے بغیر قرآن، عہد نبوی اور خلافت راشدہ کے ادوار کے جملہ احکام، نظم و نسق، طرز معاشرت و سیاست کو سمجھنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلام کے مخاطبین صرف عربی النسل نہیں تھے بلکہ وہ قیامت تک آنے والی نسل انسانی کو خطاب کرتا اور نورِ ہدایت سے سرفراز کرنے کا اعلان کرتا ہے، وہ زمان و مکان، نسل و زبان اور جغرافیائی تحدید سے بالاتر ہو کر نظام حیات پیش کرتا ہے.......... لیکن قرآن نے سب سے پہلے جس معاشرہ کو خطاب کیا، ان کی برائیوں پر انہیں تنبیہ کی اور ان کے عمدہ اوصاف پر تحسین کی، احکامات کی علل اور اسباب کو جاننے کے لئے اس ماحول و معاشرہ سے صرف نظر نہیں کیا جا سکتا۔

حواشی وحوالہ جات

(1) وھبۃ الزحیلی، الفقہ الاسلامی وادلتہ، دار الفکر، دمشق، 1984، ج2، ص838.

(2) القرآن: الشوریٰ 13.

(3) القرآن: النحل 123.

(4) محب اللہ بہاری، مسلم الثبوت، مطبع الحسینیہ المصریہ، ت۔ن، 147/2.

(5) علی بن محمد بن حسین البز دوی، کشف الاسرار علی اصول البز دوی، مکتبۃ الصنائع مصر۔ ۱۳۰۷ھ، 293/2

(6) کشف الاسرار علی اصول البز دوی، 293/2.

(7) قاضی بیضاوی، الابھاج شرح المنھاج، مطبع توفیق ادبیہ، مصر، ج2، ص180.

(8) القرآن: الانعام 90.

(9) القرآن: المائدہ 44.

(10) شاہ ولی اللہ محدث دہلوی، حجۃ اللہ البالغہ، اُردو ترجمہ از عبد الرحیم، قومی کتب خانہ، لاہور، 1983، ج اوّل، ص460.

(11) بخاری، الصحیح، ج8، ص14، مناقب تحقیق فواد عبد الباقی

(12) بدرالدین عینی، عمدۃ القاری شرح صحیح البخاری، مطبوعہ دار الطباعۃ العامرۃ، قاہرہ، ت۔ل، ج7 ص425.

(13) ''گورنرز'' کی اصطلاح ڈاکٹر محمد حمید اللہ نے اپنی کتاب ''عہد نبوی میں نظام حکمرانی'' میں استعمال کی ہے۔

(14) مسند احمد بن حنبل، ج3، ص425.

(15) شبلی، سیرۃ النبی ایڈیشن چہارم، مطبع تاجران کتب قرآن محل، کراچی، ج1، ص183.

(16) مسند احمد بن حنبل، ج2 ص11، 207,187,103.

(17) النسائی، کتاب22، باب5.

(18) مسند احمد بن حنبل، ج3، ص103.

(19) حجۃ اللہ البالغہ، حصہ اوّل، ترجمہ عبد الرحیم، ص513.

(20) ایضاً

(21) N. J Coluson A History of Islamic Law (Edinburg: Ediburg University Press-Islamic Surveys Series 1964) P118.

(22) القرآن:البقرہ189.

(23) القرافی،الفروق،داراحیاءالکتب العربیہ،قاہرہ،ج2،ص38-40.

(24) القرآن:الاسراء31.

(25) القرآفی،الفروق،دارحیاءالکتب العربیہ،قاہرہ،ج2،ص38-40.

(26) القرآن:آل عمران130.

(27) القرآن:النور33.

(28) حجۃ اللہ البالغہ،ترجمہ عبدالرحیم،حصہ اوّل،ص471.